Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور

Year 2024; Vol 03 (Issue 01)
PP. 150-161 https://journals.gscwu.edu.pk/

ساجدہ اسلم
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی ملتان

Sajida Aslam
PhD Scholar, Department of Urdu, The Women University Multan

سائنسی ایجادات میں افسانوی ادب کا کردار

The Role of Fiction in Scientific Inventions

Abstract

Science is an essential life. Which is considered a blessing for the survival of the universe. Due to the objective truths, finality and certainty of science, its results are confirmed and far-reaching. However, compared to scientific sciences, poetry and literature have always been considered as an object of entertainment and a defect at the social level. The main reason for this is the songs of flowers and bulbul, stories of love and other external elements. However, if the systematic and non-structured tradition of Urdu is studied, then the knowledge of many inventions comes from the same poetic and prose capital literature. The main theme of article is to explore the prose stories of these supposed truths in particular and poetry and literature in general. Because Dastan has acted as an assumption for scientific inventions by giving big thoughts to human. Those stories which were yesterday's talismanic mirror, science has made them a reality. In Urdu fiction, the talismanic ideas are the basis that has led to scientific inventions. And that is why we cannot reject these stories by calling them fabricated stories.

Keyword: Scientific inventions; magical theories; imaginary worlds; Urdu dastan and science; our stories and their reality

سائنس لازمہ حیات ہے۔ جسے کائنات کی بقا کے لیے ایک نعمت سمجھا جاتا ہے۔ سائنس کی معروضی سچائیوں، حتمیت اور قطعیت کے باعث اس کے نتائج تصدیق شدہ اور دور رس ہوتے ہیں۔ سائنسی علوم کے مقابلے میں شعر و ادب کو ہمیشہ دل لگی کا سامان اور سماجی سطح پر معیوب سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ گل و بلبل کے نغمے، عشق و محبت کے قصے اور دوسرے خارجی عناصر ہیں۔ تاہم اگر اردو کی منظوم و غیر منظوم روایت کا مطالعہ کیا جائے تو متعدد ایجادات کی جڑیں اسی شعری و نثری سرمایہ ادب سے پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اس مقالے کا بنیادی موضوع ان مفروضہ سچائیوں کی نثری داستانوں سے بالخصوص اور شعر و ادب سے بالعموم کھوج لگانا ہے۔ داستان اگرچہ قدیم صنف ادب ہے جس میں مافوق الفطرت عناصر موجود ہیں۔ لیکن اس نے انسانی خیالات کو بلند پروازی دے کر سائنسی ایجادات کے لیے مفروضے کا کام کیا ہے۔ نئے عہد اور جدید تقاضوں کے پس منظر میں اگر داستانوں کا کردار دیکھا جائے تو اس تکنیک نے حقیقت کا بلاواسطہ ادراک فراہم کرنے کے بجائے بالواسطہ حقیقت کی بصیرت عطا کی ہے۔

عہد جدید میں تخصیصی علوم اور مہارتوں کے فروغ نے جہاں کچھ حوالوں سے بین العلومیت کو فروغ دیا ہے وہیں ایسی فضا بھی پیدا کر دی ہے کہ علوم میں آپسی تعلق موہوم نظر آنے لگا ہے۔ سائنس کے طالب علم ادب سے خائف نظر آتے ہیں اور ادب کے قارئین سائنس سے نابلد ہیں۔ درحقیقت صورت حال یکسر مختلف ہے؛ بدلتے دور میں ادب کو سائنسی فکر و منطق اور ایجادات سے خوشہ چینی کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اسی طرح سائنس کی ادبی بنیادوں (تخیل کا منبع) کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان بنیادوں میں کسی نہ کسی لوک کہانی کی موجودگی واضح نظر آتی ہے۔ پھر چاہے وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔

قصہ کہنے اور سننے کی روایت ازل سے چلی آتی ہے۔ یہ قصے حقائق پر بھی مشتمل ہیں اور ان میں قصہ نگاروں نے تخیل کی آمیزش بھی کی ہے۔ حضرت آدمؑ اور زوجۂ آدمؑ کا جنت سے نکالے جانا کوئی من گھڑت قصہ نہیں ہے تاہم اس میں مور اور سانپ، سیب یا گندم کا دانہ کھانے جیسے واقعات کا ذکر مذہبی کتب میں مختلف طرح سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی طرح قابیل کا ہابیل کو قتل کرنا، ہاروت و ماروت فرشتوں کا شہر بابل میں آنا بھی مذہبی سطح پر تسلیم شدہ قصے ہیں۔ تاہم بیشتر افراد قصے کی اصل سے ناواقف من گھڑت اور نسل در نسل چلی آتی کہانیوں پر ہی یقین رکھتے ہیں اور اسی کو بنیادی ماخذ تصور کرتے ہیں۔ یوں ادب میں ہمیں مذہبی واقعات کے ساتھ ساتھ لوک کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ جنھیں ترجمہ کر کے اور ترمیم و اضافے کے ساتھ اردو ادب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

عربوں اور ایرانیوں سے ماخوذ قصے بہت جلد اردو داستانوں میں قبولیت حاصل کرنے لگے۔ اور یوں اردو نے اپنی ابتدا سے ہی قصے کہانی کی روایت کو جنم دیا۔ تاہم یہ سلسلہ ایک ڈیڑھ صدی تک محیط ہے۔ کیونکہ انگریزوں کی آمد نے فکر و خیال کے زاویے بدل دیے تھے جس کا ادب پر گہرا اثر ہوا تھا۔ اب جو داستانیں از خود ترجمہ و تصنیف کروائی جاتی تھیں ان میں مقصدیت کا پہلو پوشیدہ تھا۔ کیونکہ اگر من گھڑت قصے ہی لکھوائے جاتے تو ان سے انگریز حاکموں کو وہ مفاد ہرگز حاصل نہ ہوتا جس کی وہ توقع رکھتے تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ان قصوں میں فکر و تخیل کی ایسی رو موجود ہو جو ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی بھی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقصد کے پورے ہوتے ہی داستان نگاری کی اہمیت کم ہو گئی اور اس صنف

کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ آج کا دور داستانوں کا دور نہیں ہے لیکن داستانوں کو بے معنی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کا شعور ایک طویل عرصے تک تخیل و طلسمات کا اسیر رہا ہے۔ اسیری کے ان مراحل سے گزر کر ہی اس کے اندر پختگی اور بلوغت پیدا ہوئی۔ یہ عناصر انسانی شعور کے ارتقاء اور تکمیل میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اپنی حیثیت و نوعیت کے اعتبار سے ہم ان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ داستانیں ہمارے سامنے قدیم دور کے ماحول معاشرت، رسم و رواج، عقائد و نظریات اور طور طریقوں کو حقیقی روپ میں پیش کرتی ہیں۔ یوں علمی، معلوماتی اور تاریخی اعتبار سے بھی داستانوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔

سائنسی ایجادات میں افسانوی تخیل کے فعال کردار کا جائزہ لینے سے قبل داستانوں کے عرفِ عام تعارف سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ اس صنفِ ادب کو وہ مقام و مرتبہ دیا جاسکے جس کی وہ حقدار ہے۔ داستانوں میں موجود طلسمات کے حوالے سے ہمارا عام تصور مافوق الفطرت عناصر جن، بھوت، پری، دیو اور ماورائے عقل واقعات ہیں۔ جن کے بارے میں سید وقار عظیم یوں لکھتے ہیں کہ :

> "ایک وسیلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا سے الگ پڑھنے والے کے لیے رومان کا ایک جہانِ دلکش آباد کرتا ہے۔۔۔۔ بادشاہ، وزیر، امیر، تاجر سے اس دنیا کی رونق اور آبادی ہے۔۔۔۔ بادشاہوں، وزیروں، امیروں کی اس دنیا پر پریوں کا سایہ بھی ہے۔ پریاں، جن، دیو، ساحر اور نجومی رومان کی اس عجیب و غریب دنیا کے باسیوں کے مسرت و غم میں ان کے شریک ہیں۔ اور اس لیے پڑھنے والے کو اس دنیا میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہیں۔"[1]

لیکن یہ وہ تمام عناصر ہیں جن کی حقیقت قدیم زمانے میں موجود ہے اور آج بھی جنات کی موجودگی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں انسانوں کی طرح ان کے مخلوق ہونے کا واضح بیان موجود ہے۔ نیز بادشاہت سے متعلق تمام عناصر بھی حقیقی دنیا کے واقعات ہیں جن کی حقیقت کا اندازہ یونان میں بادشاہی نظام، عربوں میں بادشاہت، برصغیر میں شاہی تخت کے لیے جنگ و جدل اور برطانیہ کے شاہی دستور سے لگایا جاسکتا ہے۔ محمد بن قاسم کا ایک قیدی لڑکی کے لیے سندھ آنا اور ملتان تک کا علاقہ فتح کرنا اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خوبصورت دوشیزہ کو پری، ظالم و جابر شخص کو دیو اور جن کہنا بھی عمومی رویہ ہے۔ نجومی اور پیر فقیروں پر اعتقاد اور ان سے حساب کرانے کا عمل آج بھی جاری و ساری ہے۔ تاہم جب یہ ہی واقعات کہانی کے روپ میں رومان انگیزی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں تو جدید عہد کا انسان اور نقاد ان داستانوں کو من گھڑت اور مافوق الفطرت عناصر سے بھرپور قصے کہہ کر متعارف کرواتا ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ داستان کا قصر انہی فرضی قصوں پر کھڑا ہے۔ ڈاکٹر ابن کنول لکھتے ہیں:

> "داستان کو طول دینے کے لیے اس میں مافوق الفطرت عناصر کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ اگر داستانوں میں سے مافوق الفطرت عناصر کو نکال دیں تو داستان کی عمارت ہی ڈھے جائے گی۔"[2]

اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے داستانوں کے بارے میں خیالات قابلِ قدر ہیں۔ وہ مافوق الفطرت عناصر کو غیر حقیقی تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک یہ زمانہ قدیم کی حقیقتیں ہو سکتی ہیں۔ نیز تمام مذاہب میں بھی یہ مافوق الفطرت قوتیں یقین کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :

"جو لوگ مافوق فطرت عنصر کے دخل کو ادب میں لایعنی خیال کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اس سے یکسر چھٹکارا پانے کی کوشش انسانی نفسیات کے منافی ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ آج ہم جنھیں اپنی نارسائی ذہن کی بدولت مافوق فطرت کا نام دیتے ہیں وہ کسی بعید ترین زمانے میں حقیقت رہی ہوں اور صرف اپنی لاعلمی کی بنا پر ان کارناموں کو انسان کے بجائے مافوق فطرت کے کارنامے خیال کرتے ہیں۔"[3]

داستانوں میں داستان نگار ایک دلچسپ، متحیر کر دینے والی دنیا کو تخلیق کرتا ہے۔ جس میں ماحول، کردار، واقعات اور اشیاء سب طلسماتی ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ داستان نگار اپنی داستان میں جس ماحول کا ذکر کرتا ہے وہ سب حقیقت میں اس کے اپنے عہد کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ جسے وہ تخیل کی مدد سے ذرا ردوبدل کے بعد اچھا یا برا کر کے پیش کر دیتا ہے۔ داستان میں موجود کردار بھی اس کے ماحول سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اور وہ واقعات جنہیں داستان نگار بیان کرتا ہے وہ اس کے ذہن کی تخلیق بھی ہو سکتے ہیں۔ یا جنہیں وہ حقیقت میں دیکھ اور یا پھر کسی سے سن چکا ہوتا ہے۔ لہذا جب داستان نگار ان سب حقیقتوں کو یکجا کر کے اپنی قوتِ تخیل کی آمیزش کرتا ہے تو ایک جہانِ حیرت تخلیق ہو جاتا ہے۔ جسے ہم طلسماتی دنیا کے نام سے پکارتے ہیں اور دلچسپی سے پڑھتے ہوئے اسی دنیا میں کھو جاتے ہیں جو ہمارے خوابوں کی دنیا ہوتی ہے اور ہمارے فطری تجسس سے بھی ملتی جلتی ہے۔ سائنس دانوں نے انسانی خواہشات اور ان کی تکمیل کے لیے انہیں افسانوی قصوں کو سنا، اور ان کی تکمیل کے لیے تجربات کیے۔ جن کے نتیجے میں نت نئی ایجادات سامنے آئیں۔

طلسم دراصل آدھی سائنس کا نام ہے اور جب کسی قدر کاوش کے بعد یہ طلسم ٹوٹتا ہے تو مکمل حقیقت بن جاتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ابتداء میں یہ کائنات ایک بند گولہ تھی اور اپنے کھلنے کے بعد اس میں سے ایک نیا جہان تخلیق ہوا۔

میر امن کی داستان "باغ و بہار" کا سرسری مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک طلسمی آئینہ ہے جس کو پڑھتے ہوئے قاری اس میں کھو جاتا ہے۔ اور خود کو اسی ماحول کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ "باغ و بہار" کے خوبصورت محل، رنگین محفلیں، عظیم الشان دعوتیں، مختلف قسم کے کھانے اور طرح طرح کے لباس وغیرہ ایک اجنبی دنیا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ عہد محمد شاہی کا نقشہ ہے جسے میر امن نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن میر امن اس حقیقت کو تخیل کے رنگین فانوسوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ "باغ و بہار" میں مردانہ کردار اور نسوانی کردار ہیں۔ ناقدین کا خیال ہے کہ میر امن نے مردانہ کرداروں کی تخلیق میں فنکارانہ چابک دستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کیونکہ کہانی کے چاروں درویش دور دراز ممالک کے شہزادے ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی مردانہ اوصاف نظر نہیں آتے۔ اور نہ ہی ان کے عشق میں عظمت و وقار ہے۔ یہ تمام مرد کردار مجہول دکھائے گئے ہیں جن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔ جو کسی بھی خوبصورت شہزادی کو دیکھ کر دل و جان سے ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً انہوں نے عہدِ مغلیہ کی تصویر کشی کی ہے۔ جہاں ایک ایک بادشاہ نے کئی کئی شادیاں کی ہوئی تھیں نیز خوبصورت لڑکیوں کو محل کی

زینت اور دل بہلانے کا سامان کرنے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ اس قسم کے معاشرے کی بھرپور جھلک تخیل اور طلسمات کی مدد سے ''باغ و بہار'' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جو حقیقت وواقعیت پر مبنی ہے۔

''باغ و بہار''میں مغلیہ عہد کی زوال پرستی کی تصویر کشی چوتھے درویش کے ہاں ملتی ہے۔ ولی عہد بننے کے لیے ہونے والی اندرونی خانہ جنگی اور سازشیں بھی ہیں۔ کسی بھی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اس کے عشق میں مبتلا ہو جانے کی حقیقت بادشاہ اکبر کے زمانے میں انار کلی اور شہزادہ سلیم کے ہاں ملتی ہے اور یہاں پر انار کلی کو بچانے کے لیے سلیم کی نازک مزاجی بھی نظر آتی ہے جو فہم و فراست نہ ہونے کے سبب سازشوں کا شکار ہو جاتا ہے اور ہمیں اس کے عشق میں کوئی عظمت نظر نہیں آتی۔ یہ واقعات سمبولزم بھی ہو سکتے ہیں۔''باغ و بہار''کا مقصد چونکہ انگریزوں کو دہلی کی معاشرت سے آگاہ کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مغلیہ دورِ حکومت کو کمزور دکھانے کے لیے''باغ و بہار''کے مردانہ کرداروں میں کمزوریاں دکھائی ہیں۔ اور نسوانی کرداروں کو مردوں کی نسبت جاندار دکھایا ہے۔ اسی طرح امتیاز علی تاج نے ڈرامہ ''انار کلی''میں دلارام کی فہم و فراست، چالاکی اور معاملہ فہمی دکھائی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی سازشوں میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ میر امن کے لیے دربار میں عورتوں کی سازش اور ان کی فہم و فراست کو ظاہر کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ جن دنوں باغ و بہار لکھی گئی تب برطانیہ کے تخت پر ملکہ وکٹوریہ تھیں۔ ہندوستان میں حکومت مردوں کے ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی زوال کا شکار تھی لیکن برطانیہ میں ملکہ وکٹوریہ کے حکم پر سب کچھ ہو رہا تھا اور ہندوستان پر قبضہ بھی ایک عورت کی فہم و فراست سے ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرنے کے بہانے انگریزوں نے آہستہ آہستہ اپنے مراکز قائم کر لیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میر امن نے داستان میں مرد کردار بے جان اور نسوانی کردار متحرک دکھائے ہیں۔

سائنس فکشن کے تناظر میں دیکھیں تو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی میں سائنسی ترقی تیز سے تیز تر ہوئی اور اس نے انسانی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ سائنس کی بدولت جہاں نئے جہانِ تازہ آشکار ہوئے، وہیں نت نئے مسائل نے بھی جنم لے لیا۔ اُمید و خطرے کی اس صورت حال کو بیان کرنے کے لیے نئے بیانیے تشکیل دیے گئے۔ کیونکہ سائنس فکشن میں بھی داستانوں کی طرح تخیل کی آمیزش کی جا سکتی ہے۔ ایلینز زمین پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ زمین کے باشندے مریخ پر پانی اور آکسیجن کی تلاش کو ممکن بنا سکتے ہیں، ٹائم سپیس میں سفر کیا جا سکتا ہے۔ سیاروں کی سیر کی جا سکتی ہے۔ ایٹمی طاقت سے چند لمحوں میں پوری دنیا کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ الغرض سائنس فکشن فینٹسی کا جہان ہے، جہاں ادیب کو سب کچھ لکھنے کی آزادی ہوتی ہے۔ جیسے کہ اشفاق احمد نے اپنے افسانے ''قصاص''میں سائنس فکشن کو بیان کیا ہے۔ اس میں سابو اور دینو چچازاد بھائی ہیں جو اپنی لینڈ کرو ور پر لاہور جا رہے ہیں لیکن دو انجان شخص اپنی کلاشنکوف سے انہیں قتل کر کے چلے جاتے ہیں۔ اور دو دن بعد جب وہ قاتل جائے وقوعہ پر آتے ہیں تو لینڈ کرو ور اپنے مالکوں کا بدلا یوں لیتی ہے:

> ''قاتلوں کو اتنا قریب، اس قدر پر سکون اور ایسے گھمنڈی اور مغرور دیکھ کر لینڈ روور کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کی بتیاں ایک دم روشن ہو گئیں۔ پھر اس نے فرسٹ گیئر میں ایک سو بیس میل کی سپیڈ پر اپنے آپ کو ابھارا اور اینٹوں پر سے اچھل کر بمپر جوڑ کے گورے قاتل کو ٹکر ماری جو

کچھ دیکھے، سوچے، بولے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی تو موٹر نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اور بائیں طرف گھوم کر بھاگتے قاتل کو زور کی ایک سائیڈ ماری اور اسے زمین پر گرا دیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو لینڈ کروور نے اپنا اگلا اور پچھلا پہیہ اس پر سان کی طرح چلا دیا۔‘‘[4]

پڑھنے اور سننے میں یہ تخیلاتی دنیا کا واقعہ ہی لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دورِ حاضر میں ایسی گیمز اور موویز ریلیز ہوئی ہیں جس میں ایسی گاڑیاں اور جہاز ہوتے ہیں جن میں آٹو میٹک گنیں سیٹ کی جاتی ہیں تا کہ وہ اپنے حملہ آور پر از خود حملہ کر سکیں۔ ٹیکنالوجی جس رفتار سے ترقی کی طرف گامزن ہے وہ دن دور نہیں جب یہ سائنس فکشن حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ کیونکہ خیال ہی وہ بنیادی حقیقت ہے جو بعد میں اشیاء کی صورت نظر آتا ہے۔ اور وہ تمام مافوق الفطرت عناصر جنہیں ہم خیالی اور من گھڑت تصور کرتے ہیں کہیں نہ کہیں اپنا حقیقی وجود رکھتے ہیں۔ جیسے افلاطون کا نظریہ نقالی ہے کہ:

’’حقیقت غیر متغیر اور صرف ایک ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ فنکار مظاہر کی نقل اُتارتا ہے، حقیقت کی نہیں۔ ایک چارپائی یا ایک کرسی جسے ایک بڑھئی بناتا ہے وہ مظہر ہے حقیقت نہیں، کیونکہ حقیقی یا مثالی چارپائی ایک ہی ہے جو بڑھئی کے ذہن یا تصور میں موجود ہے۔ اس طرح بڑھئی نے صرف حقیقت یا مثال کی نقل اتاری ہے۔ چنانچہ چارپائی حقیقت سے ایک درجہ دور ہے، اور مصور، جو اُس چارپائی کی تصویر بناتا ہے، حقیقت سے دو درجے دور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس حقیقت کی تصویر پیش نہیں کر رہا جو خدا نے بنائی ہے بلکہ اُس نقل کی نقل کر رہا ہے جو بڑھئی نے عالم مثال سے کی ہے۔ چنانچہ مصور کا کام نقل کی نقل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔‘‘[5]

اس میں شبہ نہیں کہ کچھ عرصہ پہلے تک بھی طلسماتی کہانیاں پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔ گھروں میں بچوں کو سلانے سے پہلے کوئی مشہور قصہ یا لوک کہانی سنائی جاتی تھی۔ عمرو عیار، ٹارزن، چھن چھنگلو سیریز اور آنگلو بانگلو جیسی چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھی جاتی تھیں۔ لیکن اکیسویں صدی میں ٹیکنالوجی نے ان داستانوں کو کتابوں سے نکال کر انٹرنیٹ کی دنیا میں داخل کر دیا ہے۔ وہ ہی جادوئی دنیا اب کارٹون، ٹام اینڈ جیری اور ہیری پوٹر کی صورت دکھائی جاتی ہے۔ یہ مافوق الفطرت عناصر دنیا کے ہر خطہ میں مانے جاتے ہیں جنہیں فلمی دنیا میں پیش کیا جاتا ہے۔ کل داستان طلسماتی جہان تھا۔ آج سائنس نے داستانوی دنیا کو جدید ٹیکنالوجی میں بدل دیا ہے۔ قدیم زمانے میں علم والے اور جادوگر ہزاروں میل کی باتیں سن لیا کرتے تھے۔ اور یہ بات عام ناظر و قاری کے لیے حیرت انگیز تھی۔ تاہم آج ٹیلی فون، موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعے نہ صرف ہزاروں کوس کی باتیں سنی جاسکتی ہیں بلکہ ان کو دیکھا بھی جاسکتا ہے۔

سائنسی ایجادات میں داستانوی تخیل کا جائزہ لینے کے لیے جب ہم اس خیالی دنیا کا رخ کرتے ہیں تو بہت سارے انکشافات سامنے آتے ہیں۔ حضرت سلیمان کی جن و انس، چرند پرند پر حکومت سے قطعی انکار ممکن نہیں ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو جدید دور میں یہ ہی جنات ٹیکنالوجی میں بدل

چکے ہیں۔ آج کسی بھی زبان کو سمجھنا، کسی دور پرے کے انسان کی خبر رکھنا مشکل نہیں ہے۔ داستانوں میں کبوتر، طوطے، ہدہد اور جادوئی پرندے خبریں لے کر آتے تھے لیکن آج انسٹا گرام، واٹس ایپ، میسینجر، فیس بک، ای۔ میل، سکائپ اور سنیپ چیٹ جیسے کئی برقی پرندے موجود ہیں جن سے ہمیں دوسرے افراد کی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اور وہ جادوئی سکرین جو کہانیوں میں جادو کے زور سے بنائی جاتی تھی، پھر سامنے موجود شخص سے گفتگو کی جاتی، وہ دورِ حاضر میں ویڈیو کالز کی صورت میں موجود ہے۔

اسی طرح بچوں کی کہانیوں میں جو جادوئی گلوب تھے ان میں شاہِ جنات کے محل کی طرف آنے والے کسی بھی اجنبی اور خطرے کو پہلے سے دیکھا جاسکتا تھا۔ عصرِ حاضر میں جدید کیمرے اور ڈرون کیمرے ان کا متبادل بن چکے ہیں۔ جادو کے زور سے جنوں اور پریوں کا ہوا میں اڑنا اور آگ برسانا تخیلاتی تھا لیکن اب پیراشوٹ، جنگی طیارے، میزائل بم اور ڈرون طیارے ان فوق الفطرت عناصر کا حقیقی روپ ہیں۔ کہانیوں کے اختتام پر ہونے والا ایک زوردار دھماکہ تمام طلسماتی محلات کو دھواں بنا کر اڑا دیتا تھا۔ اب ایٹمی بموں سے انسانی بستیاں ختم کی جاتی ہیں۔ وہ اڑن کھٹولہ جو ہوا میں لیے پھرتا اور پلک جھپکنے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتا تھا وہ آج جہاز کی صورت میلوں کے سفر کو سالوں اور مہینوں کے بجائے گھنٹوں میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی خیال کی صورت ممکن ہوا ہے جس کے بارے میں ہمارے داستان نگاروں نے تخیل کیا۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان (1803ء) میں موجود کل کا گھوڑا جس کے جسم کے مختلف جوڑ الگ الگ بیان کیے گئے تھے۔ اڑتا تھا تو ہوا سے باتیں کرتا تھا۔

کہوں کیا میں اُس اَسپ کی خوبیاں
پرندوں میں کب ہوں یہ محبوبیاں
ذرا کل کے موڑے، فلک پر ہوا
جو کہیئے تو کہیئے اُسے باد پا
یہ گھوڑا جو اِس گل کے تھا بخش کا
فلک سیر تھا نام اُس رخش کا
سرِ شام وہ بے نظیر جہاں
اسی رخش پر ہو کے جلوہ کُناں
ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ
وہی اِک پہر سَیر کرتا تھا وہ [6]

آج جب ہم دیکھتے ہیں تو یہی کل کا گھوڑا جس کو میر حسن نے اپنی مثنوی میں ۱۷۸۲ء میں نظم کیا تھا اب موٹر بائیک اور کار کے روپ میں آ چکا ہے۔ جدید دور کا انسان تعویز اور جادو کے اثرات کو کسی صورت نہیں مانتا لیکن ہندسے کی اہمیت کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ہی ہندسے آج بائنری سسٹم کے تحت ہمارے برقی نظام کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اشیاء خورد و نوش سے لے کر ہر چیز پر جو قیمتیں اور جو پروگرام چلائے جاتے ہیں وہ سب انہی ہندسوں کی وجہ سے کام کر رہے ہیں۔ اور وہ مشہور قول جو ایک نقطے پر دنیا کی بنیاد کا پتا دیتا تھا کچھ وقت پہلے تک متعجب اور ناقابلِ یقین تھا، تاہم موبائل میں موجود سم کارڈ کی چِپ اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ اب دنیا واقعی ایک نقطے پر سمٹ آئی ہے۔ جس کے ذریعے دنیا کے کسی بھی ملک اور کسی بھی جگہ بیٹھے شخص سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کا تصور بیسویں صدی تک محض خام خیالی ہی تھا۔

داستان نگار اپنی قوتِ تخیل سے ایک جادوئی دنیا بساتے تھے جس کی عمارتیں مسحور کن نظر آتی تھیں۔ ان میں موجود ہر چیز ہی سحر طاری کر دیا کرتی تھی۔ لیکن سائنسی ایجادات نے ان سب جادوئی اشیاء کو جدید مشینری میں بدل دیا ہے۔ جہاں لمحوں میں چیزوں کو پاؤڈر بنانے، دھونے، کھانا بنانے کی سہولتیں موجود ہیں۔ الف لیلیٰ ہزار داستان میں بیان کردہ علی بابا چالیس چور کا قصہ بھی ایسا ہی ہے۔ جس کو داستان نگاروں نے بعد میں کسی قدر ترمیم و اضافے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں چوروں کا ایک غار کو جادوئی منتر سے کھولنا محیر العقل ہے:

> ''چوروں میں سے جو سب سے نمایاں تھا وہ ان کا سردار لگتا تھا۔ اس نے بھی باقی چوروں کی طرح تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ سردار اس چٹان تک آیا جو درخت کے پاس تھی۔ اُس نے چند جھاڑیاں ہٹا کر بلند آواز میں یہ الفاظ کہے: کُھل جا سم سم! یہ کہتے ہی چٹان میں ایک دروازہ کُھل گیا۔ جب ایک ایک کر کے سب چور اندر جا چکے تو سردار نے بھی اندر قدم رکھا۔ اُس کے اندر جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔''[7]

لیکن یہ حیرت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ہم جدید شاپنگ مالز کے آٹومیٹک سلائیڈنگ ڈورز اور الیکٹرک سلائیڈنگ سیڑھیاں دیکھتے ہیں۔ اگر یہ بند ہوں تو انسان کی موجودگی کو محسوس کرتے ہی بند دروازے کھل جاتے ہیں اور سیڑھیاں چلنے لگتی ہیں۔ الہ دین کا چراغ جو کہ اب محاورتاً بھی استعمال ہوتا ہے رگڑنے پر جن کا حاضر ہونا اور اور حکم بجا لانا ہماری دلچسپی کا باعث تھا۔ لیکن سائنسی دور میں انٹرنیٹ گوگل پر لکھ کر ہم جو command اُسے دیتے ہیں وہ ممکنہ حد تک ہمیں اس کے بہت سے نتائج مہیا کرتا ہے یہ طلسماتی الہ دین کا چراغ اب حقیقت میں ہر شخص کے ہاتھ میں موجود ہے۔

طلسماتی کہانیاں پڑھنے والے عمرو عیار کی طلسماتی زنبیل سے واقف ہوں گے جو بظاہر چھوٹے تھیلے کی صورت میں نظر آتی تھی لیکن اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہوتی تھی۔ موجودہ دور میں وہ زنبیل موبائل، لیپ ٹاپ اور فلیش میں بدل چکی ہے جس میں بے پناہ مواد رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً گھریلو ٹوٹکے، کتابیں، تصویریں، کھیل، تربیتی لیکچرز وغیرہ۔ اسی طرح داستان میں جب کسی خوبصورت شہزادی کو کوئی دیو یا جن اُٹھا کر لے جاتا

تھا تو قاری ایک عجیب طرح کے خوف میں مبتلا رہتا تھا لیکن جب وڈیرے اور طاقت ور غریب لڑکیوں پر اپنا حق سمجھنے لگے تو ہم نے دیکھا کہ وہ مافوق الفطرت خوفناک حقیقت میں بدل چکے ہیں۔

داستانوں میں طلسماتی گھر اور جزیروں پر بسیرا ہوا کرتا تھا۔ سمندروں میں جادوئی محل بنائے جاتے تھے۔ لیکن اب یہ جادوئی محل ہمیں حقیقی دنیا میں نظر آتے ہیں۔ دبئی میں موجود انڈر واٹر ہوٹل جسے جانی مانی ہستیاں ہی چنتی ہیں، مکمل شیشے سے بنایا گیا ہے اس میں رہ کر سمندری مخلوق کو دیکھنا کسی جادوئی دنیا کو دیکھنے سے کم نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ داستانوں میں غریب حال لڑکی پر چھڑی گھما کر اسے خوبصورت بنا دیا جاتا تھا، یا پھر کسی شہزادے کو دیو مکھی بنا دیا کرتے تھے۔ اور پڑھنے والوں میں بھی یہ خواہش جنم لیتی تھی۔ پھر بیوٹی پارلر بنے اور جادوئی چھڑی کی جگہ بیوٹی کیم جیسے سوفٹ ویئر بنائے گئے جہاں بننے والی تصویر خوبصورتی کا شاہکار ہوتی ہے۔ نیز ان بیوٹی کیمز میں ایسے فیچرز بھی رکھے گئے جو تصویر بنانے والوں کو بلی، بندر اور دوسرے روپ بھی دے سکتے ہیں۔

ایجادات و دریافت کی دنیا میں ایک اور قصہ دیکھیں تو مثنوی ''سیف الملوک'' میں سیفل جب اپنے دوست کے ساتھ مہم پر نکلتا ہے تو ان کا جہاز سمندری طوفان کی نذر ہو جاتا ہے اور انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے موجودہ سائنس نے سمندر میں اس طلسماتی حصے کو دریافت کر لیا ہے جو بحر اوقیانوس میں پانی کی سطح پر موجود ہے اور سمندر کا یہ مخصوص ایریا مثلث نما ہے جسے ''برمودہ ٹرائی اینگل'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں سے جو بھی جہاز فضا یا سطح سمندر سے گزرتا ہے، وہ غائب ہو جاتا ہے۔ اور اس ایریا کے اندر آکر قطب نما بھی (سمت بتانے والا آلہ) کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

داستانوں میں بیان کیے جانے والے طلسمات، زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کا ذریعہ ہیں۔ معلومات، کاروباری سہولیات، وقت کی بچت، سفر میں آسانی، تعلیمی استعداد میں اضافہ اور برقی میڈیا سے کتب تک رسائی نیز شعبہ صحت تک میں اس کے دور رس نتائج دیکھنے کو ملتے ہیں۔ رجب علی بیگ سرور کی ''فسانہ عجائب'' (1824) میں قالب بدلنے والا اسم اعظم بتایا گیا ہے جس کو پڑھ کر انسان اپنی روح کو دوسرے جسدِ خاکی میں منتقل کر سکتا ہے۔:

> ''جان عالم نے نشے میں انجام کار نہ سوچا اُس فیلسوف کے رونے سے بے چین ہو گیا کہا اگر تجھے یہی امر ناگوار ہے تو سُن لے جو اصرار ہے مجھے ملکہ کے باپ نے یہ بات بتائی ہے کہ جسکے قالب میں چاہوں اپنی روح لیجاؤں اُسنے پوچھا کس طرح شہزادے نے ترکیب بتا دی جب وہ سب سیکھ چکا بولا غلام کو بے امتحان غلطی کا گمان ہے شہزادہ اُٹھکر جنگل کی طرف چلا چند قدم بڑھکر بندر مردہ دیکھا کہا دیکھ میں اُسکے قالب میں جاتا ہوں یہ کہہ کے شہزادہ زمین پر لیٹا بندر اُٹھ کھڑا ہوا وزیر زادے کو سب ڈھنگ یاد ہو گیا تھا فوراً وہ کور نمک زمین پر گرا اپنی روح جانعالم کے قالب خالی میں لا کھڑا ہوا اور گھر سے تلوار نکال اپنا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں پھینک دیا۔''[8]

موجودہ سائنس اس طلسم کو DNA کلوننگ کی مدد سے پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لفظ کلوننگ کا مطلب کسی جاندار کی ہو بہو کاپی تیار کرنا ہے جس کا ڈی۔ این۔ اے بالکل اصل جاندار سے ملتا جلتا ہو۔ وہ جاندار جانور، پودے اور حتی کہ انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ انسانی جسم کی کلوننگ کرنے کو ہیومن کلوننگ کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک زندہ یا مردہ آدمی کے ڈی این اے سیلز کو کاپی کر کے ایک اسی طرح کا شخص دوبارہ تیار کرنا۔ ہیومن کلوننگ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک کو تھری پیٹک کہا جاتا ہے۔ جس میں انسانی جسم کے سیلز کو لے کر میڈیسن یا ٹرانسپلانٹ کے مقصد کے لیے کلون کیا جاتا ہے یعنی علاج کی غرض سے ایک انسانی جسم کے سیلز کے ذریعے انسانی اعضاء کو مصنوعی طور پر تیار کر کے لیبارٹری میں لگایا جاتا ہے۔ جو کہ میڈیکل فیلڈ میں انتہائی کرامت ہے۔ کیونکہ فرض کریں اگر کسی انسانی جسم کا مکمل بازو یا ٹانگ نہیں تو اس انسان کے جسم کے سیلز کو ہی لے کر لیبارٹری میں نیا بازو یا ٹانگ تیار کی جائے گی۔ اور اسے کامیابی سے لگا دیا جائے گا اور اس دوران آرگن یا ٹشو کا بھی مسئلہ درپیش نہیں ہو گا۔ اب تک اس کے مزید طریقوں پر ریسرچ کی جا رہی ہے۔

دوسرا طریقہ ری پروڈکٹیو طریقہ کہلاتا ہے۔ جس میں صرف چند اعضاء کی بجائے پورے کے پورے انسان کو کلوننگ کر کے تیار کیا جاتا ہے۔ ہیومن کلوننگ کا آغاز بیسویں صدی سے ہی ہو گیا تھا لیکن یہ موضوع بحث 1960ء سے بنا۔ 1966ء میں امریکہ میں لکھے گئے آرٹیکل میں اسے غیر اخلاقی اور تباہ کن عمل قرار دیا گیا۔ آج میڈیکل ٹیکنالوجی اس قابل ہو چکی ہے مگر پھر بھی کچھ ایسی رکاوٹیں ہیں جو بنی نوع انسان کے اس اختیار کے حاصل کرنے میں حائل ہیں کیونکہ انسان کو پیدا کرنا اور تخلیق کرنا اللہ تعالیٰ کی ہی خصوصیت ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ جو طریقہ سائنس نے بعد میں دریافت کیا اس کے بارے میں رجب علی بیگ سرور نے 1824 میں تخیل کی مدد سے لکھ دیا تھا۔

داستانوں میں راتوں رات امیر ہونے کے قصے بھی موجود ہیں۔ ''الف لیلہ و لیلہ'' کی ایک کہانی جس میں بغداد سے ایک مسافر مصر میں تلاشِ روزگار کے لیے آتا ہے۔ اور والی (تھانیدار) اسے چور سمجھ کر قید کر لیتا ہے۔ احوال بتانے پر پتا چلتا ہے کہ اسے خواب میں مصر جا کر روزی تلاش کرنے کا حکم ہوا تھا۔ جس پر والی ہنستے ہوئے کہتا ہے کہ:

> ''اے بے وقوف! میں نے تین بار خواب میں دیکھا ہے کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ بغداد میں فلاں شکل کا ایک گھر ہے اور اس کی تعریف یہ ہے اس کے صحن میں ایک چھوٹا سا باغ ہے جس کے نیچے ایک گڑھا ہے اور اس گڑھے میں بہت مال و دولت ہے۔ وہاں جا کر اُسے لے لے مگر میں نہ گیا۔۔۔۔۔ جس مکان کا والی نے ذکر کیا تھا وہ اسی شخص کا گھر تھا۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو گڑھے کو کھودا اور اس میں سے بے حد مال ملا۔ اس طرح خدا نے اس کی روزی میں بڑی برکت دی۔''[9]

ستر ہویں اٹھارویں صدی تک ہمیں یہ باتیں خواب و خیال جیسی ہی لگتی تھیں لیکن آن لائن روزگار کی سہولتیں، پاؤنڈ، سکوں اور اسٹاک مارکیٹنگ، money making games اور قرعہ اندازی ایسے کھیل راتوں رات امیر کرنے میں معاون ہیں۔ نیز ہمیں اس مذہبی قصہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جس میں حضرت موسیٰؑ کو ایک اہل علم کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملتا ہے اور دیوار بلا اجرت اس لیے سیدھی کی جاتی ہے تا کہ دو

یتیم بچوں کا مال محفوظ رہ سکے۔ لیکن یہ واقعہ آج ہمارے لیے حیرت کا باعث ہے کہ مال و اسباب کو زیر زمین دفن کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ البتہ بینک اکاؤنٹس، جاز کیش اور ایزی پیسہ اکاؤنٹ ہمیں متعجب نہیں کرتے جن میں خطیر رقم محفوظ کی جاتی ہے اور لین دین کا محفوظ ذریعہ بن چکے ہیں۔

درج بالا بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اردو داستانیں اپنے وقتوں میں دلچسپی کا باعث اور تفریح کا سامان تھیں۔ جنہیں انیسویں صدی کے اواخر میں من گھڑت قصے کہہ کر نظر انداز کیا جانے لگا۔ انگریزوں نے برصغیر میں رائج داستانوں کے اردو تراجم کرائے اور پھر اردو ناول کو فروغ دیا۔ انہوں نے ہمیں منطقیت اور سائنس کے پیچھے لگا کر بظاہر ہمارا رشتہ تخیل سے بھرپور داستانوی ادب سے توڑ دیا۔ تاہم خود سائنس فکشن اور سپر ہیروز کی سیریز کے ذریعے ہمارے داستانوی سرمائے ادب کو اپنایا اور اُسے اپنے سماج میں فروغ دیا۔ مغرب میں سائنس فکشن، جادوئی حقیقت نگاری، فینٹسی، ہیروک اور اس طرح کے ادب کا فروغ در حقیقت داستان کے نئے جنم کا تسلسل ہی ہے۔ جو ان کی نسلوں اور سماج کو تخیل کا عروج فراہم کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کوئی بھی بڑی تخلیق تب ہی سامنے آتی ہے جب اس کی کوئی اکائی یا بنیاد ہو۔ جدید دور کی تمام ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات کو تقویت دینے میں ان ہی افسانوی خیالات کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ جنہوں نے زمین میں بیج ڈالنے کا کام کیا اور سائنسدانوں نے اس تخیل کی زمین میں تازہ افکار پھونک کر نئے جہان آباد کیے۔ لہٰذا اِن مخیر العقل واقعات کو جھوٹی باتیں کہنا داستان کی صنف کے ساتھ ہر گز انصاف نہ ہو گا، جن کے ذریعے ہمیں ہر روز ایک نئی ٹیکنالوجی اور سہولت ملتی ہے۔ کسی بھی شے کو گھر بیٹھے حاصل کرنا، اپنے کام کو سر انجام دینا، انہیں ایجادات کی صورت ممکن ہوا ہے۔ اس لیے بلا تامل یہ کہا جا سکتا کہ طلسماتی خیال اور اردو داستانیں ہی وہ بنیاد ہیں جو سائنسی ایجادات کی وجہ بنیں اور ہم ان کی اہمیت و حیثیت سے انکار نہیں کر سکتے۔

حوالہ جات:

1. وقار عظیم، سید، "داستان سے افسانے تک"، (دہلی: طاہر بُک ایجنسی، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۰
2. ابن کنول، ڈاکٹر، "داستان سے ناول تک"، (نئی دہلی: ایس این لینگوئج اکیڈمی، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۸
3. فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، "اردو کی منظوم داستانیں" (کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۱۹۷۱ء)، ص ۵۹۔۶۰
4. اشفاق احمد، "قصاص"، مشمولہ طلسم ہوش افزا، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۴۔۱۵
5. عابد صدیق، "مغربی تنقید کا مطالعہ افلاطون سے ایلیٹ تک"، (ملتان: ثاقب پرنٹرز اینڈ پبلشرز، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۸
6. میر حسن دہلوی، "مثنوی سحر البیان"، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص ۸۸۔۸۹
7. محمد سلیم الرحمٰن، "علی بابا چالیس چور"، (لاہور: اِلقا پبلیکیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۲
8. رجب علی بیگ سرور، "فسانۂ عجائب"، (الہ آباد: لالہ رام نرائن لال، ۱۹۲۸ء)، ص ۱۷۹
9. ابوالحسن منصور احمد، ڈاکٹر (مترجم)، "الف لیلہ ولیلہ"، جلد سوم (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۲ء)، ص ۳۲۵۔۳۲۶